اُردو افسانہ: ۸ر اکتوبر کے تناظر میں

عاصمہ روبینہ *
Aasma Robina
ڈاکٹر سعید احمد **
Dr. Saeed Ahmad

Abstract:

"Human history is replete with many incidents which have brought about a lot of destruction throughout the world. These incidents had been of various natures e.g. earthly or heavenly, and political or social. Not only human lives but literature of every age, too, is affected by these incidents. This article also deals with a similar calamity i.e. Earthquack, which destroyed Northern areas of Pakistan on 8th October, 2005. It has left deep marks on Pakistani people and Urdu Literature simultaneously. The short stories written as a result of this incident not only depict the destruction of these areas but also highlight negative and positive role played by various social and welfare organizations."

۸ر اکتوبر ۲۰۰۵ء کو آٹھ بج کر باون منٹ پر آزاد کشمیر اور ارضِ پاک کے چند ہنستے بستے، شہروں اور بستیوں میں قیامت صغریٰ برپا ہوئی۔ بھری پُری آبادیاں اور وادیاں لمحوں میں زیروزبر ہو گئیں۔ باخبر اور بے خبر سب خاک و خون میں غلطاں ہو گئے۔ نہ کوئی محکوم بچا اور نہ حاکم ہزاروں شیر خوار اور کم سن مٹی اور پتھروں کی گہرائیوں میں دفن ہو گئے۔ اکثر گھرانوں کے نہ تو مرنے والوں کا پتہ چل سکا اور نہ مرنے والوں پر رونے والوں کا۔ جو زندہ بچ گئے ان میں زندہ رہنے کی خواہش مر چکی تھی۔ فضا خاک اور خون سے آلودہ تھی۔

اسلام آباد سمیت لاہور اور ملتان بھی اس زلزلے کی لپیٹ میں تھے۔ لیکن اصل تباہی آزاد کشمیر، شمالی علاقہ جات، مظفر آباد اور بالا کوٹ میں ہوئی تھی بالا کوٹ کا پورا گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ ان سر سبز اور خوبصورت پہاڑوں نے اپنی ہی وادیوں اور وادیوں میں بسنے والے باسیوں کو نگل لیا تھا۔ اس زلزلے نے ماضی میں گزرے بہت سے قدرتی سانحات اور آفات کی یاد تازہ کر دی تھی جس نے عذابِ الٰہی کی شکل میں شہروں کو نابود اور قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا۔

☆ پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد
☆☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

اس سانحہ کے فوراً بعد قومی اور بین الاقومی فلاحی تنظیمیں بغیر کسی تاخیر کے آفتِ ارضی کے شکار، مجبور ولاچار انسانوں کی مدد کے لے پہنچ گئیں تا کہ زندہ بچ جانے والوں کے زخموں پر مرہم رکھ سکیں۔ اس سانحہ کا اثر جہاں ملکی اور غیر ملکی دونوں سطح پر بہت گہرا ہوا وہیں پر پاکستانی ادیبوں نے بھی اس سانحہ پر دل کھول کر لکھا جس میں زیادہ تر رثائی شاعری شامل ہے۔ فکشن میں افسانہ لکھنے والوں نے بھی سانحہ کی تباہ کاریوں اور اس کے نتیجہ میں جنم لینے والے المیوں کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ اس موضوع پر جس صنف میں سب سے کم توجہ ملی وہ ناول ہے۔

''زمین بنام سرکار'' شعیب خالق کا ایک خوبصورت علامتی افسانہ ہے۔ جس میں مصنف نے براہ راست ۸/ اکتوبر کے واقعے کی طرف تو کوئی اشارہ نہیں کیا البتہ ایک مقدمے کی کارروائی کو پیش کیا ہے۔ جس میں زمین نے سرکار پر زلزلوں، سیلابوں اور مختلف حادثات میں ہلاک ہونے والی اولاد کے قتل کا الزام لگایا ہے۔ زمین کا مطالبہ ہے کہ اس قتل کے جرم میں سرکار کو کہکشاں بدر کیا جائے۔ آفاقی عدالت میں آج اس مقدمے کا فیصلہ سنایا جانا ہے اس لیے دونوں طرف کے وکیل جو انسان ہیں عدالت میں پہنچ چکے ہیں وکیل استغاثہ کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے اپنے موقف کو عدالت میں پیش کرتا ہے:

> ''میری موکلہ ایک ماں ہے اور ماں کبھی اولاد کو یوں غارت گری کا نشانہ نہیں بنا سکتی۔ یہ سب سرکار کے بنائے ہوئے ارتقائی کھیل کا تماشہ ہے اور اسی لیے زلزلوں اور ناگہانی آفات میں مارے جانے والے انسانوں کا قتل سرکار ہی کے حصے میں آتا ہے سو میری موکلہ کی معزز عدالت سے یہ درخواست ہے کہ سرکار کا انسانوں پر اپنا بنایا ہوا ارتقائی جبر لاگو کرنے کے جرم میں کہکشاں بدر کیا جائے۔''(۱)

وکیل استغاثہ کے موقف کے جواب میں وکیل صفائی جواب دیتے ہیں:

> ''Your Honour فاضل وکیل استغاثہ نے میرے موکل کی جو سزا تجویز کی ہے دراصل وہ اس کی اپنی سزا کی طرف بھی ایک اشارہ ہے۔ زمین کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لی جائے، تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب ایسی ناگہانی آفات کے واقعات نہ گزرے ہوں۔ ایسے واقعات پر انسانوں کی حیرت فطری عمل ہے مگر انہیں پوشیدہ نشانیوں سے ڈرنا چاہیے اور خاص طور پر Your Honour ان تمام غیر معمولی واقعات سے ڈرنا چاہیے جو انسانوں کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔''(۲)

کہانی میں زمین اور سرکار کے وکیل ایک دوسرے سے بحث میں مشغول رہتے ہیں جس میں وکیل استغاثہ سرکار کو موردِ الزام ٹھہراتے رہے لیکن سرکار اس کو ایک ارتقائی عمل قرار دیتے رہے۔ بحث کے آخر میں جج صاحب نے سرکار کے وکیل کو آخری موقع دیا تاکہ وہ آخر میں کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ جس پر سرکار کے وکیل نے ان تمام سیلابوں اور زلزلوں کو انسان کے ایٹمی دھماکوں کا نتیجہ قرار دیا:

> "Your Honour آخری موقع دینے پر میں عدالت کا مشکور ہوں تو جناب عالی! انسان نے زمین کے پیٹ میں ہزاروں ایٹمی دھماکے پروئے۔ ان دھماکوں کی لرزاہٹ کا حقیر سا ارتعاش ابھی اور بہت سے سیلابوں، طوفانوں اور زلزلوں کی صورت آگے آرہا ہے اور Your Honour انسانوں نے تو زمینی زلزلوں کے فطری عمل کو اپنی مرضی سے بڑھاوا دینے کی مشین بھی ایجاد کر رکھی ہے۔ زمین تو بے چاری معصوم ہے جو انسان کے بہکاوے میں یہاں تک چلی آئی اور اسے یاد نہیں اس کے چہرے پر انسان نے دو ایٹم بم گرائے۔ اسے اندھا بنایا اور چہرے کی جلد مسخ کر دی۔ رہی سہی کسر انسانیت نے جدید کھادوں کی آمیزش سے مٹی کے رزق کو پھوکا بنا کر پوری کر دی ہے...
>
> Your Honour زمین کی تاریخ میں آج تک زلزلوں، سیلابوں اور طوفانوں کے باعث اتنی اموات نہیں ہوئیں جتنی زندگیوں کے خون سے انسان کے اپنے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ زمین اور اس کے بیٹے ہنوز انسانیت کے قتل کا کھیل اس وقت بھی زمین پر کھیل رہے ہیں۔ Your Honour ابھی تو انسانی کوتاہیوں سے ہوائی زمینی اور سمندری حادثات میں مارے جانے والوں کی فہرست الگ ہے۔
>
> Your Honour دیومالائی نفسیات سے باہر اس کائنات میں گر انسانوں کی اصل اور حقیقی جنت کا وجود ہے تو صرف اور صرف زمین ہی ہے اور اس کی طبعی عمر کا آزاد رکھوالا بھی انسان خود ہے سرکار نہیں۔"(۳)

اس علامتی افسانے میں افسانہ نگار نے ان زلزلوں اور سماوی سانحات کا ذمہ دار خدا اور انسانی گناہوں کی بجائے ایٹمی دھماکوں، جنگلات کے کٹنے اور ماحولیاتی آلودگی کو قرار دیا ہے۔ سرکار کے وکیل کے مطابق اس زمین کا دشمن اس کی دینی اولاد یعنی انسان ہی ہے جو اس تمام تباہی اور غارت گری کا اصل ذمہ دار ہے۔

''ملبہ سانس لیتا ہے'' حمید شاہد کا افسانہ ہے جس میں انہوں نے ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء میں آنے والے زلزلے کی تباہی کو بیان کیا ہے۔ لیکن اس افسانے میں انہوں نے زلزلے کی تباہ کاری کو براہ راست بیان کرنے کی بجائے جزوی طور پر بیان کیا ہے۔ کہانی چار عنوانات کے تحت تقسیم کی گئی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ماسٹر فضل جو ہے۔ کہانی کا پہلا حصہ ''جب آدمی کے پاس فرشتے اترے'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس حصے میں ماسٹر فضل جو کی فضلاں کے ساتھ شادی کو بیان کیا گیا ہے۔ جو ان پڑھ ہونے کے باوجود ایمان کی روشنی سے منور ہے۔ ماسٹر فضل جی کے والد مسجد کے امام تھے اور بی بی صاحبہ بھی نہایت متقی اور پرہیز گار خاتون تھیں۔

دوسرے حصے کو ''لذت کہاں تھی''؟ کا عنوان دیا گیا ہے جس میں ماسٹر فضل جو اور فضلاں کی زندگی کو بیان کیا گیا ہے جو پہلے بچے کی پیدائش پر ہی انیس سال کی عمر میں فوت ہو گئی۔ لیکن اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی روز رات کو خواب میں فضل جو کو کمرے میں فضلاں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔

کہانی کا تیسرا حصہ ''زمین چلنے سے پہلے'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں مصنف نے اپنے بیٹے اور بہو کی زندگی کو بیان کیا ہے جو مارگلہ ٹاور اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد وہ اپنے والد امام صاحب کا موازنہ خود سے اور اب اپنے بہو اور بیٹے سے کرتے رہتے ہیں انہیں اس زندگی میں مادیت پرستی اور خدا سے دوری صاف نظر آتی ہے۔

> ''جب تک وہ اپنی زندگی میں الجھے رہے سب کچھ ٹھیک ٹھیک چلتا رہا مگر ریٹائرمنٹ کے بعد اور اپنی عمر سے مات کھا کر جب سے وہ بیٹے کے ہاں اٹھ آئے تھے ان کے اندر بہت توڑ پھوڑ ہوئی تھی۔ انہیں خدا سے جو معاملہ رہا تھا وہ اس جدید طرز کے ٹاور کے کسی اور حصے میں ہو تو ہو وہاں نہیں تھا جہاں ان کا بیٹا اور بہو رہتے تھے۔''[۴]

اس ساری رات بھی فضلاں ماسٹر صاحب کو تنگ کرتی رہی۔ اُن کو منع کرتی رہی کہ ان لوگوں کے لیے قرآن پاک پڑھنے کا کیا فائدہ جو اپنے لیے خود پڑھ سکتے ہیں لیکن پڑھتے نہیں ہیں۔ وہ انہیں بار بار کہتی کہ آپ میرے لیے تلاوت کیجئے۔ آج ماسٹر صاحب کو بار بار بی بی صاحبہ کی باتیں بھی یاد آتی رہیں۔

کہانی کا اگلا حصہ ''ملبا درد کی گرہیں کھولتا ہے'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ جس میں ۸/اکتوبر کو آنے والے زلزلے کی تباہ کاریوں کے ساتھ ساتھ حکومتی اور سیاست دانوں کی بے حسی سے

بھی پردہ اٹھایا ہے جو ملبے کے اوپر کھڑے ہو کر بلند و بانگ دعوے کرتے اور چلے جاتے جبکہ ملبے کے نیچے ماسٹر صاحب کی صورت زندگی ابھی سانس لے رہی تھی لیکن اس کو بچانے کی طرف ان کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

"لگ بھگ یہ وہی وقت بنتا ہے... ملبے کے اوپر چڑھ کر تصویریں بنوانے والا... اور وہ بھی یوں جیسے کوئی شوباز شکاری پہلے سے مرے ہوئے کو دیکھے اور اس کے بدن پر پاؤں رکھ کر لوگوں کے دلوں پر دھاک بٹھانے کے لیے تصویریں اتروانا شروع کر دے۔ ہاں، عین وہی وقت تھا جب اوپر سے کدال پڑنے اور لوہا کاٹنے کی آوازیں آنے والے کے پروٹوکول میں کچھ وقت کے لیے معطل ہو گئی تھی۔ تب سیمنٹ اور سریے کی کئی تہوں تلے ماسٹر فضل جو کو اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔"(۵)

زلزلے میں اسلام آباد میں واقع مارگلہ ٹاور کے علاوہ تتری کوٹ سے خاکوٹ تک بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی تھی۔ تباہی میں ہزاروں انسان لقمہ اجل بن چکے تھے۔ لیکن ان لاشوں کو اٹھا کر قبروں میں ڈالنے والے بھی موجود نہیں جس کی وجہ سے ماحول تعفن زدہ ہو چکا تھا:

"جو ابتدائی اندازے تھے وہ سارے غلط ہو چکے تھے۔ تتری کوٹ سے خاکوٹ تک پہاڑوں پر بستیاں لاشوں سے بھری پڑی تھیں اور انہیں بے گور و کفن پڑے اتنا وقت گزر چکا تھا کہ تعفن چھوڑنے لگی تھیں۔ انہیں یا تو دفنانے والا کوئی نہیں بچا تھا اور اگر کوئی بچ گیا تھا تو اپنوں کی اتنی لاشیں زمین میں دبا چکا تھا کہ اس کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔"(۶)

افسانے میں جہاں افسانہ نگار نے حکومتی اور سیاسی اہل کاروں کی بے حسی پر حرف اٹھایا وہیں اس سانحہ کے دوران میڈیا کے کردار پر بات کرتے ہوئے بھی گہرے طنز کا مظاہرہ کیا گیا ہے جن کا مقصد صرف و صرف اپنی خبروں کو پہنچانا اور دوسرے ٹی وی چینل پر سبقت لے جانا تھا:

"ادھر شہر کے وسط میں ڈھے جانے والے ٹاور سے بھی لاشیں نکالی جا رہی تھیں۔ ملبے میں سے گاہے بگاہے زندہ لوگ بھی نکل آتے تھے۔ اور جب ایسا ہوتا تو متحرک اور ساکت تصویریں بنانے والے کیمروں کو اٹھائے میڈیا کے منتظر لوگ بھاگ بھاگ کر اس کی تصویریں اتارنے اور رپورٹیں نشر کرنے میں سبقت لے جانے میں مگن ہو جاتے۔"(۷)

"تر کی کا کمبل" ڈاکٹر شیر شاہ سید کا لکھا ہوا افسانہ ہے جس میں انہوں نے جہاں ۸/ اکتوبر میں ہونے والی تباہی کی طرف اشارہ کیا وہیں پر ان علاقوں کے لوگوں کی ہوس اور فریب پر بھی گہرا طنز کیا ہے۔ کہانی کا راوی اور مرکزی کردار مانسہرہ کے قریب چٹہ بٹہ کا رہنے والا ہے۔ لیکن کسب معاش کے سلسلے میں کراچی مقیم ہے۔ کراچی میں مختلف چھوٹی بڑی نوکریاں کرنے کے بعد وہ ایک بحری جہاز میں ملازمت اختیار کر لیتا ہے جس سے اُس کے حالات زندگی بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ چٹہ بٹہ میں اپنے گھر کو پکا کرواتا ہے۔ اور ایک بہتر زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔

ایک دن جب اس کا جہاز ابھی ممباسہ سے روانا ہی ہوا تھا تو اس کو ٹی وی کے ذریعے خبر ملی کہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں شدید زلزلہ آیا ہے جس میں بالا کوٹ، مظفر آباد، گڑھی حبیب اللّٰہ تباہ ہو گئے ہیں جبکہ اُگی، کالا ڈھاکہ، اپر چھٹا میں تباہی آئی۔ کراچی پہنچتے ہی راوی فلائٹ لے کر اپنے گھر کو روانہ ہوتا ہے گھر میں ماں اور باپ کو موجود نہ پا کر حیران ہوتا ہے لیکن سفر کی تھکان کی وجہ سے جلد سو جاتا ہے۔

صبح جب اُس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے بچوں اور بوڑھے والدین کو امدادی سامان اور کیمپوں سے اشیاء خورد و نوش لاتے دیکھتا ہے تو اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کیونکہ نہ تو اُس کے گھر میں کوئی تباہی ہوئی تھی اور نہ ہی چٹہ بٹہ کے دوسرے لوگ اس امداد کے مستحق تھے:

> "مجھے ایسا لگا جیسے بوڑھے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ میرے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔ یہ زلزلہ جس نے لاکھوں سے اوپر آدمی مار دیے اور پانچ لاکھ سے اوپر زخمی کر دیے، پہاڑوں کو ہلا دیا، بلڈنگوں کو گرا دیا، ندی نالوں کے رستے بدل دیے۔ یہ سب تو مالی نقصان تھے۔ یہ تو ہوتا ہی ہے یہ تو ہوتا رہے گا، مگر زلزلہ میرے ابان جان کو بھکاری بنا دے گا۔ میرے بچوں کو فقیر کر دے گا۔ میری بیوی، میری ماں امدادی سامان کا انبار لا کر گھر میں ذخیرہ کریں گے۔ میرے چٹہ بٹہ۔ مانسہرہ، ہزارہ، کشمیر کوہستان اور بشام کے ایماندار، محنتی غیرت والے لوگ اتنے بے غیرت ہو جائیں گے۔ میں صرف سوچتا اور جلتا رہا۔ نہ جانے کب تک اپنے گھر میں خود مجرم بنا رہا۔"(۸)

افسانے میں مصنف نے اس المیے کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس سانحہ کے دوران دیکھنے میں آیا کہ کہیں تو اس امدادی سامان کی اشد ضرورت تھی لیکن وہاں تک سامان کچھ تو تباہی کی وجہ سے پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ جبکہ دوسری طرف ایسے بھی لوگ تھے جو بلا ضرورت اس سامان کو لاتے اور

گھروں میں ذخیرہ کرنے لگے۔ افسانہ نگار نے انسانی بے حسی کے اس جذبے کو بے نقاب کرنے کی ایک خوبصورت کوشش کی ہے۔ آخر میں وہ اس ہوس اور بے حسی کے نظام سے بغاوت کرتا ہے:

> ''اس دن چٹہ بٹہ کے لوگوں نے دیکھ لیا کہ میں نے اپنے گھر کے سامنے ترکی کا کمبل بچھا کر اس پر یو این او کے تیل کے ڈبے، لندن کے سویٹر، ملتان کی چادر، کراچی کے بسکٹ، لاہور کے دودھ کے ڈبے، جرمنی کے ٹینٹ، ایک کے اوپر ایک رکھ کر آگ لگادی تھی۔ پورے چٹہ بٹہ کے لوگوں کے سامنے۔''(۹)

''آگے خاموشی ہے'' ایک ایسے متاثرہ استاد کی کہانی ہے جو زلزلہ کے وقت اپنی کلاس لے رہا تھا۔ دوران کلاس وہ شرارت کرنے والے حمید اللّٰہ کو ڈانٹ کر کلاس سے باہر نکال رہا تھا کہ اچانک زلزلہ آ گیا اور سارا کمرہ ایک دم زمین بوس ہو گیا۔ کچھ طالب علم ایک دم ملبے کے نیچے آنے سے وفات پا گئے۔ جبکہ استاد نور دین اور چند طالب علم ابھی زندہ تھے۔ کافی دن تک نور دین ملبے تلے بچ جانے والے طالب علموں کی ہمت بندھاتا رہا کہ امدادی ٹیمیں آنے والی ہوں گی وہ ہمیں یہاں سے نکال لیں گی لیکن جب کافی روز گزر گئے تو آہستہ آہستہ کر کے تمام طالب علم دم توڑتے گئے اور نور دین پر بھی غشی کے دوڑے پڑنے لگے وہ کئی کئی گھنٹے بے ہوشی میں گزار دیتا۔

افسانے میں جہاں زلزلے کی تباہی کا ذکر ہے وہی حکومتی سطح پر امدادی ٹیموں کی کمی اور سست روی کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ اگر وہ ٹیمیں بروقت پہنچ جاتیں تو بہت سی جانیں بچ سکتی تھیں۔ جو کافی دن مدد کے انتظار میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتی رہیں۔

> ''کئی روز بعد جب ریسکیو ٹیم وہاں پہنچی تو سکول کے ملبے کے نیچے سے آنے والی ساری آہٹیں، کراہیں اور صدائیں خاموش ہو چکی تھیں، بچے کھچے زخمی مرد سارا دن مدد، علاج اور خوراک کے لیے ادھر اُدھر بھاگ دوڑ کرتے۔''(۱۰)

ان امدادی ٹیموں کے دیر سے پہنچنے پر جہاں لوگوں کے دلوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑتی وہیں پر وہ افراد جو اپنے پیاروں کو کھو بیٹھے تھے ان امدادی ٹیموں پر چڑھ دوڑتے اور انہیں بُرا بھلا کہتے۔

> ''ریسکیو ٹیم کو دیکھ کر ان کا ردعمل ملا جلا تھا بعض عورتیں انہیں دیر سے آنے پر ڈانٹ رہی تھیں اور طعنے دے رہی تھیں۔ کیوں کہ اب کسی کے زندہ بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں رہ گیا تھا مگر بعض اب بھی پُر امید تھیں۔ پچھلے چند روز میں وہ کئی طرح

کی خبریں سن چکی تھیں۔ بعض بچے اور بڑے کئی کئی روز بعد کھائے پیے بغیر زندہ بر آمد ہوئے تھے۔"(۱۱)

اسی امدادی ٹیم نے احمد دین کو مردہ سمجھ کر ملبے سے نکالا۔ تمام میّتوں کی تصویریں اتارتے ہوئے فوٹوگرافر نے محسوس کیا کہ احمد دین زندہ ہے اس لیے اس کو جلدی سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسلام آباد کے ہسپتال پہنچا دیا گیا کافی دن کی مشقت کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا لیکن ایک دن اچانک احمد دین کا وہ طالب علم ہسپتال پہنچا جس کو شرارت کی سزا پر کلاس روم سے نکالا گیا تھا، اُسے دیکھ کر احمد دین میں دوبارہ زندگی کی رمق دوڑنے لگی اور اس کو یاد آیا کہ اُس روز کیا ہوا تھا۔ منشایاد زلزلے کی ہولناکی کا منظر کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انہوں نے حمید اللہ کو کلاس سے باہر نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر جونہی اس نے کلاس روم سے باہر قدم رکھا، لگا جیسے اسی بدبخت نے انگریزی فلموں کے کسی تخریب کار ولین کی طرح ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر دھماکا کر دیا ہو۔ ایک شدید جھٹکا آیا۔ پورا کلاس روم ڈولنے لگا۔۔ دیواریں ڈگمگائیں۔ کمرے کی ہر چیز لرزنے اور ہچکولے کھانے لگی اور ایک دھماکے کے ساتھ چھتیں ان کے اوپر آگریں۔ ایک ساتھ بہت سی چیخیں بلند ہوئیں پھر سناٹا چھا گیا۔ پھر جب انہیں ہوش آیا تھا تو وہ ملبے کے نیچے دبے ہوئے تھے اور لڑکوں کی چیخیں، کراہیں اور سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ان کی چیخ پکار سن سکتے تھے مگر حرکت کر سکتے تھے نہ جواب ہی دے سکتے تھے۔"(۱۲)

کہانی کا انجام بہت ڈرامائی انداز میں اچانک اس وقت ہوتا ہے جب ماسٹر احمد دین جو تیزی سے روبہ صحت تھے ٹی۔وی پر چلنے والے ایک پروگرام میں سنتے ہیں کہ زلزلے اور قدرتی آفات اصل میں انسان کے گناہوں کی سزا کے طور پر نازل ہوتی ہیں۔ یہ سنتے ہی احمد دین کچھ دیر مضطرب رہتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔ افسانہ زلزلے کی تباہ کاریوں، امدادی ٹیموں کی سست روی اور زلزلے میں متاثرہ ایک استاد کی نفسیاتی کشمکش کا نمائندہ ہے جو اپنے طالب علموں کو موت سے ہمکنار ہوتے دیکھنے کے بعد اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔

انور زاہدی کا افسانہ "فالٹ لائن" اصل میں انسان کی بے ثباتی اور کم مائیگی کی نشاندہی ہے۔ انسان جو اپنے لیے بڑے بڑے پلان بناتا ہے، دراصل وہ اپنے اگلے لمحے کے بارے میں بھی بے خبر ہے کہ وہ زندہ رہ پائے گا کہ نہیں۔ افسانے کا مرکزی خیال بھی اسی انسانی بے بسی کے گرد

گھومتا ہے۔ افسانے کی تمام فضا ایک بیوروکریٹ کے گرد بُنی گئی ہے جو اپنے محکمہ کا سربراہ ہے اور ریٹائرمنٹ کے قریب ہے لیکن وہ ایکسٹینشن لینے کے لیے حکومتی سطح پر کوشش کرتا پھر رہا ہے۔ ہر روز دفتر کے چھوٹے عملے میں اُن کی مدت معیاد کے بڑھنے پر گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں لیکن ابھی تک پتہ نہیں چلتا کہ آیا مدت معیاد بڑھ جائے گی کہ نہیں۔ اسی دوران ایک دن ملک کے شمالی علاقہ جات میں زلزلے کی خبر سے پورا دفتر ہل جاتا ہے۔

> ''چھٹی کا دن تھا اور اچانک ملک کا شمالی حصہ جس میں دارالحکومت کے علاوہ شمال کے کوہستانی علاقے بھی آئے تھے ایک خوفناک زلزلے کی لپیٹ میں آ گئے تھے... دارالحکومت میں ایک بلند و بلا ٹاور ایسا زمین بوس ہوا تھا کہ نہ جانے کتنے خاندان زندہ درگور ہوئے اور جو باقی بچے ان کی حالت بھی زندوں جیسی نہ تھی... شمالی علاقہ جات میں شہر کے شہر زمین برد ہو گئے۔ قصباتی بستیاں اور چھوٹے چھوٹے سینکڑوں دیہات صفحہ ہستی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود ہو چکے تھے...''(۱۳)

اس زلزلہ کے بعد چیف صاحب کو جو ادارے کے سربراہ تھے زلزلہ سے متاثرہ علاقوں کے دورے پر جانا پڑا۔ لیکن جب وہ دورہ کر کے واپس لوٹ رہے تھے تو ان کا جہاز راستہ میں ہی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ نوکری کی مدت معیاد بھی پوری نہیں کر پاتے اور اس دنیا سے چل بستے ہیں۔

افسانے میں کہانی کار نے انسان کی ہوس پر کاری ضرب بھی لگائی ہے اور ہمارے موجودہ نظام سے پردہ بھی اٹھایا ہے۔ جو رشوت، چور بازاری اور سفارش کے ذریعے دوسروں کے حق اور کرسی پر ڈاکہ ڈالنے میں کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں کرتا لیکن طمع، لالچ اور ہوس کا مارا یہ انسان اتنا نہیں جانتا کہ اُس کی زندگی کی سانس اگلے لمحے اس کا ساتھ بھی دے گی یا نہیں۔

''الاماں! الاماں! الاماں!'' انور نگینوی کا افسانہ ''الاماں! الاماں! الاماں!'' مظفر آباد کے علاقے میں آنے والی تباہی کا احوال ہے۔ افسانے میں ایک شخص رشید بٹ کے ذریعے اس قیامت کا احوال بیان کیا گیا ہے۔

> ''وحشتیں بڑھیں، جنون لپکے چہرے فق ہوئے، کلیجے شق ہوئے۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگے۔ درخت بار بار گر گر یوں اٹھ رہے تھے جیسے مریدان طریقت بوقت مناجات اپنی زلفوں کو لہرا لہرا کر جھومتے ہیں۔ بہت سوں کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

خواب خواب ہی رہ گئے۔ دومنٹ بھی نہ گے اور سب اپنے اپنے گھروں کی قبروں میں دفن ہو گئے۔ ہنستا بستا شہر چند لمحوں میں ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گیا"(۱۴)

مظفر آباد جو پہاڑوں کے درمیان اور دریائے نیلم کے درمیان واقع ہے۔ مصنف نے اُس پہاڑ کو زمین بوس ہو کر دریائے نیلم میں گرنے کے مناظر کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ایسے کہ یہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

"اچانک سامنے کا پہاڑ پھٹ پڑا۔ اس نے دیکھا ایک دیو ہیکل چٹان تیزی سے نیچے آ رہی ہے۔ مٹی، دھول اور پتھروں کی بارش کرتی ہوئی۔ اک شور قیامت کے ساتھ وہ سیدھی نیلم میں جا گری۔ نیلم نے بہنا چھوڑ دیا۔ اس کا پانی چڑھ کر پھیلنے لگا۔ سیلاب کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ نیلم بڑی سڑک اور پہاڑ کے درمیان ذرا نشیب میں بہتا ہے۔ چٹان کے گرنے سے سڑک بھی بند ہو گئی۔ ٹریفک موقوف ہو گیا۔ اب کوئی امداد دے کر بھی آئے تو کیسے آئے۔ مظفر آباد ہر آنے جانے والے کے لیے علاقہ ممنوعہ بن چکا تھا۔"(۱۵)

۸/اکتوبر کو گزرنے والی اس قیامت کا اصل المیہ ہی یہی تھا کہ ان پہاڑی علاقوں کا زلزلے کی وجہ سے باقی دنیا سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زخمیوں اور ملبے کے نیچے دب جانے والوں کے پاس امداد نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ لیکن پھر بھی اس سب میں پاکستانی بہادر فوج کو سلام جنھوں نے بڑی جاں فشانی سے اس کام کو سرانجام دیا اور امدادی کاموں کو تیز تر بنایا:

"فوج کے نوجوان کل شام سے ہی دریائے نیلم کو صاف کرنے پر لگے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کاوشوں سے نیلم نے پھر بہنا شروع کر دیا شہر میں ایک کیمپ لگا دیا گیا تھا۔ بچوں عورتوں کو اس میں لا لا کر رکھا جا رہا تھا۔ ایک عارضی سا ہسپتال بھی قائم ہو چکا تھا۔"(۱۶)

"خاک میں چھپا چاند" ایک ایسے گورکن کی کہانی ہے جیسے کافی دن سے کوئی مزدوری نہیں ملی تھی۔ وہ دنوں قبرستان میں بیٹھا سوچتا رہتا کہ اگر اسی طرح ایک دو روز اور اس کو کوئی قبر کھودنے کو نہ ملی تو وہ کیسے گھر کا خرچ چلائے گا۔ اپنی اس سوچ پر وہ شرمندہ بھی ہے لیکن مجبور ہے کیونکہ اسی سے اُس کی روزی بندھی ہے۔

"گورکن گہری سوچ میں گم تھا کہ اگر آنے والے دو تین دن بھی اسے مزدوری نہ ملی تو گھر میں فاقے پڑنے لگیں گے۔ پتہ نہیں لوگوں نے کب سے مرنا چھوڑ دیا ہے۔

ایک خیال بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن میں آدھمکا تھا مگر وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ "نعوذ باللہ! یہ میں کیا اول فول بک رہا ہوں" وہ ہاتھوں سے کانوں کی لو چھو کر توبہ کرنے لگا۔"(۱۷)

گورکن کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی دعا ایسے قبول ہو گی کہ اُسے اگلے ہی دن اپنی ہی اولاد کو قبر میں اتارنا پڑے گا۔ وہ تو اپنے بیٹے کی نئے بستے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے صبح سویرے خود گاوں کا چکر لگا کر آیا تھا کہ شاید کہیں سے رونے کی آواز آرہی ہو۔ لیکن جیسے ہی وہ گاؤں کا چکر لگا کر قبرستان پہنچا پورا قبرستان ایک بار اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ دیوانہ وار گاؤں کی طرف بھاگا گاوں کا کوئی گھر نہ بچا تھا اور اُس کے بیٹے کا اسکول بھی ملبہ بن چکا تھا بہت تلاش کے بعد اس کو اپنے بیٹے کی لاش ملتی ہے۔ لاش دفناتے ہوئے اس کو اپنے بیٹے کی ایک مدت پہلی کی ہوئی بات بھی یاد آجاتی ہے:

"بابا اگر میں مر گیا تو تُو مجھ پر بھی مٹی ڈال دے گا؟"(۱۸)

افسانہ جہاں گورکن کی معاشی بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہے وہیں زلزلے کی تباہی کے بعد امدادی ٹیموں اور حکومتی امداد کے بروقت نہ پہنچنے کا نوحہ بھی۔

"معاف کرنا بیٹا، ابھی کوئی اور مٹی ڈالنے کے لیے نہیں پہنچا۔"(۱۹)

"قیامت کے بعد" خالد قیوم کا افسانہ "قیامت کے بعد" اسی موضوع پر ایک موثر افسانہ ہے جس میں انہوں نے زلزلے کی قیامت کے بعد اُن متاثرین پر گزرنے والی قیامت کو ایک مردہ عورت کی زبانی بیان کیا ہے۔ افسانے کا موضوع اگرچہ زلزلہ اور اُس کی تباہ کاری ہی ہے لیکن افسانہ نگار نے اس کے بعد ان متاثرین سے ہونے والی غیر انسانی اور غیر اخلاقی سلوک کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ اس قیامت کے گزرنے کے بعد جہاں پوری قوم نے اس درد کو محسوس کرتے ہوئے یکجہتی کا ثبوت دیتے ہوئے متاثرین کے لیے دل کھول کر مدد کی وہیں پر کچھ ایسی چیزیں بھی دیکھنے میں آئیں جن کے ذکر سے ہی انسان لرز اُٹھتا ہے۔ افسانے کی راوی ایک مردہ لاش ہے جو امداد کا انتظار کرتے کرتے بالکل نڈھال ہو چکی ہے۔ افسانے کے ایک ایک لفظ میں طنز کے گہرے تیر ہیں جو کہیں کہیں نشتر کی شکل اختیار کر جاتے ہیں:

"تم اس وقت پہنچو گے جب کوئی اور نیا حادثہ، المیہ، آفت یا سانحہ برپا ہوا ابھی تو... پہاڑوں کے دامن میں کسی منے سے پانڈے جیسی پیاری بستی اور اس بستی کے

کروڑوں ٹن ملبے تلے دبے مسکینوں کے لیے مددگاروں کی آمد سراسر ہیچ ہو جائے گی... تم کفِ افسوس مت ملو کیوں کہ لاشیں کپڑوں اور خوراک کے لیے ضد نہیں کرتیں۔"(۲۰)

بات یہی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد ان متاثرین سے جو غیر انسانی سلوک ہوا اُس کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتی ہے کہ جب اس نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ اس طرف کو آرہے ہیں تو نیچے دبے ہوئے لوگوں کو کچھ ہمت ہوئی اُسی میں وہ بھی شامل تھی لیکن وہ اس وقت ششدر رہ گئی جب اس نے دیکھا کہ جنہیں وہ مسیحا سمجھ رہی تھی وہ تو لٹیرے تھے وہ تو انسان کہلانے کے بھی قابل نہیں تھے:

"تم سے پہلے جو پہنچے... وہ نہایت جلدی میں تھے... اور جلدی میں جو کچھ ان کے ہاتھ لگا لے گئے... تمہیں کیسے بتاؤں کہ ان کی عجلت کا کیا عالم تھا... عجلت میں وہ کان، ناک، ہاتھ، بازو یہاں تک کہ سر بھی کاٹ کر لے گئے... ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہیں وقت کی کمی کا کوئی اندیشہ لاحق نہ تھا... ان مطمئن وحشیوں نے بچی کھچی سانسوں کو پامال کیا، زخم زخم تمناؤں کو روندا، سسکتی بلکتی امیدوں کو نوچا، کھسوٹا اور جاتے جاتے دم توڑتی عظمتوں کو یوں چھوڑ گئے جیسے پھل کھانے کے بعد چھلکے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔"(۲۱)

مصنف نے ایسے لوگوں کے لیے انساں نما کا لفظ استعمال کیا ہے جو ان مصیبت کے ماروں کو بھی اپنی درندگی اور ہوس کا نشانہ بنا گئے۔

"وہ جو تم سے پہلے پہنچے جنہیں ہم نے مددگار جانا تھا اور تم نے مددگار سمجھا ہو گا... جو ہمارے لیے سہارے کا تنکا ثابت ہو سکتے تھے... جنہیں دیکھ کر نیم مردہ اجسام میں اٹھتی درد کی ٹیسوں کو لمحاتی قرار ملا تھا اور جن کی آوازیں سن کر ملبے تلے دبی آہوں، کراہوں اور ہچکیوں کو ذرا ٹھہراؤ ملا... مگر وہ، وہ نہ تھے جنہیں ہم سمجھے وہ کچھ اور تھے... وہ کچھ ایسے تھے جسے غول بیابانی... وہ انساں نما تھے... انسان ہر گز نہ تھے... ان کے دل سوز سے خالی اور نگاہوں میں حرص، ہوس و ناپاکی تھی... وہ سراسر سراب تھے... وہ ایسے قذاق تھے جن کی نظریں ڈوبتے جہاز کے مسافروں کی بجائے ان کے مال پر جمی ہوتی ہیں۔"(۲۲)

افسانہ اس موضوع پر لکھے گئے تمام افسانوں میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے جس میں ادب کی چاشنی بھی ہے۔ درد بھی ہے سوز بھی اور انسانیت پر فائز ایسے انسانوں کے لیے ایک سوال بھی جو انسان کے روپ میں انسانیت پر ایک دھبہ ہیں۔

''آخری گیت'' سجاول خاں کا افسانہ ''آخری گیت'' بھی امدادی ٹیموں کے دیر سے پہنچنے اور زندہ لوگوں تک اُن کی رسائی نہ ہونے کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ کہانی کا راوی ایک باپ ہے جس کی دونوں بیٹیاں سکینہ اور زرینہ اور بیگم صغراں ملبے تلے دب چکے ہیں جبکہ ایک سالہ بیٹا جھولے میں صحیح سلامت پڑا ہے لیکن بھوک کی وجہ سے بلبلا رہا ہے۔ ملبے کے نیچے لاچار باپ اور ماں کی بے بسی دیدنی ہے اور انہیں اپنے بچوں کے لیے کسی مسیحا کا انتظار ہے جو آئے اور انہیں اس مصیبت سے آزاد کرائے۔

> ''میرا جسم زخموں سے چور چور ہو چکا ہے۔ میری سانس سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہیں ہیں اور سانس کے ساتھ چیخیں سر بہ فلک پہنچ رہی ہیں۔ انسانوں کے دلوں پر کب دستک دے پائیں؟ منوں ٹن ملبے کے نیچے اس انتظار میں ہوں کہ کوئی آئے اور مجھے اور میرے بیوی بچوں کو بچالے اور بتائے کہ افطار کا وقت ہو گیا ہے۔''(۲۳)

کافی دن یہ خاندان ملبے تلے دبا رہتا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں تک پہنچ نہیں پاتے لیکن انہیں ہمت سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں اور ڈھارس دیتے ہیں کہ جلد اُن کی مدد کے لیے خدا امداد بھیجے گیا۔ ایک دن اچانک اُن کو ملبے کے اوپر سے لوگوں کی آوازیں آتی ہیں۔ میاں بیوی دونوں کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی کہ اب وہ اپنے بچوں کو بچالیں گے، ملبے کے اوپر کے لوگوں کو بھی احساس ہوتا ہے کہ نیچے کوئی زندہ ہے لیکن شاید قسمت ان کا ساتھ ایک بار پھر چھوڑ جاتی ہے جو مدد اتنے قریب ہونے کے باوجود ان سے دور ہوتی جارہی تھی۔ بعض اوقات چیزیں آپ کے اتنے پاس ہوتے ہوئے بھی آپ کی دسترس سے باہر ہوتی ہے۔ ایسے ہی ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ ہوا تھا جو اپنے بچوں کو زندہ سلامت دیکھنے کی خواش میں دوبارہ جی اٹھے تھے لیکن اگلے ہی لمحے جب امدادی ٹیم کی بات سنتے ہیں تو ایک بار پھر خود کو اندھی کھائی میں گرتے محسوس کرتے ہیں:

> ''صغراں کو لگتا ہے، اللہ نے ہماری سن لی ہے۔ ہمیں نکالنے والے آگئے ہیں ... الحمدللہ'' اس نے بمشکل بچے پر نگاہ ڈالی جو نیم آنکھوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو ''ماں بھوک تو بہت ہے، پر اب کہوں گا نہیں۔''

"تھوڑی دیر اور میرے بیٹے...ماں صدقے، تمہیں ضرور دودھ پلاؤں گی۔"(۲۴)

"ہمیں یہاں رکنے کا حکم نہیں ہے" ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی جو کسی افسرانہ تحکم کے تحت بلند ہوئی تھی۔ بھاری بوٹوں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی اور اس کے ساتھ امید کی نبضیں بھی ڈولنے لگیں۔"(۲۵)

فیاض عزیز نے بھی اپنے افسانے "کفن" میں اُن لوگوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جو مصیبت کے اس گھڑی میں بھی لوٹ مار سے باز نہیں آتے۔ کہانی میں دونوں باپ اور بیٹا زلزلہ زندگان کے لیے آئے امدادی سامان کو چرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن افسانے کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ دونوں باپ اور بیٹا جب تباہ حال لوگوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں رحم پیدا ہو جاتا ہے۔

افسانے میں اُن لوگوں کا المیہ بھی بیان کیا گیا ہے جن کے ہاتھ ہمیشہ دینے والوں میں ہوتے تھے۔ لیکن قسمت کے ایک جھٹکے نے انہیں عرش سے فرش پر لا کھڑا کیا تھا۔

"ان متاثرین میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے ہمیشہ لوگوں پر عطا کی تھی۔ اب مانگنے کا ہنر انہیں کیا آتا۔ چنانچہ یہ لوگ سب سے زیادہ ناکام نظر آتے تھے۔"(۲۶)

"ایک بچے کا خط اللہ میاں کے نام" شاکر حسین کا افسانہ ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جو ۸/ اکتوبر کے زلزلے میں زندہ بچ جانے والوں میں شامل ہے۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ جب زلزلہ آیا تو وہ سکول کے پلے گراؤنڈ سے کچھ دور تھا۔ اس کے سب ساتھی سکول کے نیچے ہی دب گئے تھے وہ پریشانی میں اپنے گھر کی طرف جاتا ہے لیکن واپس جاتے وہ حیران ہوتا ہے کہ یہ تو وہ راستہ نہیں ہے جس پر چل کر وہ ہمیشہ اپنے گھر جاتا تھا۔ گھر کے راستے میں نانی ماں کا گھر بھی ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ اور بوڑھی نانی بے جان پڑی تھی۔ بچہ جب گھر پہنچتا ہے تو اپنی ماں کو اپنے انتظار اور استقبال کے لیے آج منتظر نہیں پاتا۔

"اس سے پہلے جب میں گھر داخل ہوتا تھا تو میری ماں آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا کرتی تھی لیکن اس دن ماں خاموش ہو چکی تھی۔ پھر مجھے اپنی ایک سالہ بہن کا خیال آیا وہ تو ماں کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزارا کرتی تھی۔ میں اسے گڑیا کہہ کر پکارتا تھا...میں نے دیکھا گڑیا بھی ماں کے سینے کے ساتھ لگ کر موت کی نیند سو چکی تھی۔"(۲۷)

یہ ساری معلومات کہانی کا راوی جو ایک پانچ سالہ بچہ ہے ایک خط میں لکھتا ہے جو وہ اللہ میاں کو لکھ رہا ہے۔ خط میں وہ اپنی بپتا خدا کو سنانے کے بعد خدا سے مختلف سوال بھی کرتا ہے کہ آخر اُس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ وہ مختلف لوگوں سے سن چکا ہے کہ آفات انسانوں کے گناہوں کے نتیجے کی وجہ سے آتی ہیں۔ اس لیے وہ خدا سے معصومانہ انداز میں سوال کرتا ہے کہ اس سب میں بچوں کا کیا قصور تھا انہوں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔

"رحمن کو کہیں سے شک ہو گیا ہے کہ اس کا بھائی زلزلے کی نذر ہو گیا ہے۔ وہ اس بات کا اظہار نہیں کرتا لیکن بار بار ایک بات پوچھ رہا ہے کہ اس زلزلے میں جو معصوم بچے جاں بحق ہوئے ہیں ان کا کیا قصور تھا۔ انہوں نے کونسے گناہ کیے تھے۔ بڑی عمر کے لوگوں کے گناہ تو بہت ہوتے ہیں۔ اس لیے خدا ان کے لیے سزا تجویز کرتا ہے۔ لیکن معصوم بچے کس جرم میں مارے گئے ہیں"(۲۸)

افسانے کے آخر میں بچہ خدا سے اس کے غفور اور رحیم ہونے کی وجہ سے اس کی رحمت کی دعا مانگتا ہے تا کہ اُن کی مشکل آسان ہو سکے۔ افسانے کو ایک بچے کے خط کے ذریعے بیان کر کے افسانہ نگار نے کہانی میں ندرت پیدا کی ہے۔

"سفید بھالو" بھی ایک ایسے ہی بچے کی کہانی ہے جو زلزلے میں اکیلا رہ گیا ہے۔ زلزلے سے ایک شام پہلے مونی اپنے باپ کے ساتھ بازار جاتا ہے تا کہ لندن سے آئے چچا صفیر کی دعوت کی جا سکے۔ چچا صفیر اس کے لیے ڈھیر سارے کپڑے، جوتے اور چاکلیٹ لایا تھا لیکن بازار میں مونی کو ایک لال ٹائی والا سفید بھالو پسند آ جاتا ہے۔ وہ سارا راستہ باپ سے ضد کرتا ہے کہ اُسے بھالو لے کر ہی گھر جانا ہے لیکن منیر کے پاس مونی کی خواہش پوری کرنے کے لیے اتنے پیسے نہیں تھے۔ اس لیے وہ اُس کو زبردستی گھر لے آتا ہے جب اس کے چچا کو مونی کی خواہش کا پتہ چلتا ہے تو وہ فوراً بازار جانے کے لیے تیار ہوتا ہے تا کہ وہ بھالو مونی کو دلا سکے لیکن رات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ مونی سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ صبح ہی اُس کو وہ سفید بھالو خرید کر دے گا۔ مونی اسی خوشی میں صبح کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ لیکن صبح اپنے ساتھ کونسی قیامت لائے گی اس کا دن میں سے کسی کو بھی نہ پتہ تھا۔

"ابھی مونی جاگا نہیں تھا کہ کسی بے ترتیب لمحے میں وقت اور فطرت اپنی چال چل گئے۔ خواب حقیقت سب بکھر گئے خاک خاک میں جا ملی۔ ایک المیے کی گواہی رقم کر کے لہو بے جان ہو کر پتھروں پر جم گیا۔ شناخت بے شناختی کے مرحلوں سے

گزرتی ہوئی کہیں پھر شناسائی اور کہیں صرف صدا بن کر رہ گئی جس کا جواب کہیں نہ تھا۔ کوئی تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ کچھ ادھورے تھے۔ کچھ بظاہر مکمل، مگر مکمل کی تعریف سے عاری۔

زندگی کے عناصر کے چند لمحوں کے بے اعتنائی نے صدیوں کی مسافت اور رفاقت کو ملبے کے ڈھیروں تلے دفن کر دیا۔''(۲۹)

زلزلے کے بعد جب اُسے ہوش آئی تو وہ ایک ہسپتال میں تھا اور اُس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو کٹ چکا تھا۔ وہ بہت دنوں سے ہسپتال تھا لیکن بولنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سب کو دیکھتا رہتا۔ اچانک ایک دن ہسپتال کے دروازے سے بالکل ویسا بھالو اندر آتا ہے جیسا اُس نے بازار میں دیکھا۔ یہ دیکھتے ہی مونی کو ایک دم یاد آتا ہے کہ اُس روز کیا ہوا تھا۔ وہ اونچی آواز میں سفید بھالو کہتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔

''سفید بھالو نے جلدی سے تکیے پر گرتے ہوئے مونی کے سر کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نے دل کی دھڑکن کو پہنچانے کی ناکام کوشش کی، مگر وہاں سناٹا تھا۔ گہرا سناٹا۔ اس نے دکھ کے انبار تلے سر ہلا کر نیلے بلوروں کے کناروں پر اس کی جھار کو اپنے ہاتھوں سے گرا دیا۔''(۳۰)

''میرا روزہ ہے'' قیوم مروت کا افسانہ ''میرا روزہ ہے'' بھی زلزلے کی تباہ کاریوں کا احوال سناتا ہے۔ کہانی کا راوی کریمو ایک بڑے گھر میں کام کرتا ہے۔ ۸/ اکتوبر کے دن بھی وہ حسب معمول کاموں میں مصروف تھا۔ اس کو گھر کے مالکان پر غصہ بھی آرہا تھا جو بغیر نماز پڑھے ناشتہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ابھی وہ ان کی اسی غفلت پر جل رہا ہوتا ہے کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ سا ہوتا ہے وہ اس دھماکے سے بچنے کے لیے ایک دم لیٹ جاتا ہے لیکن اس احتیاط کے باوجود اس کا پاؤں بُری طرح زخمی ہو جاتا ہے۔

''کریم ابھی کھلے چمن میں ہی داخل ہوا تھا۔ محسوس کیا کہ جہاں وہ تھا۔ وہ جگہ گیند کی طرح ہوا میں اوپر اچھلی اس کے پاؤں ڈگمگائے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہا۔ اس کے کانوں میں دھماکے گونجنے لگے۔ ایسے جیسے پورے شہر میں ہر سمت جگہ جگہ بم پھٹ رہے ہوں۔ اس کے پاؤں کے نیچے زمین برابر ہل رہی تھی ارد گرد مکانوں کے گرنے اور درختوں کے تڑاخنے کی آوازیں پھر مردوں، عورتوں اور بچوں کے

چیخنے کی آوازیں اس کے کانوں میں آنے لگیں، اچانک زور کا جھٹکا لگا۔ اور وہ زمین پر آرہا اور اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔"(۳۱)

کریم ہوش میں آنے کے بعد سے امدادی ٹیم اور فوج کے جوانوں کے ساتھ اپنے گھر والوں کو تلاش کرتا ہے۔ روز ملبہ اٹھاتا ہے کہ کوئی گھر والا مل جائے ایک دن اسی کوشش میں اسے کچھ لوگ اکٹھے نظر آئے جب وہ اس جگہ پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی ماں سامنے زندہ پڑی تھی جب وہ تیزی سے ماں کی طرف پانی لے کر جاتا ہے تو ماں پانی پینے سے انکار کر دیتی ہے کیونکہ وہ روزے سے ہے۔

"کریم نے جب غور سے دیکھا تو اس کا دل اچھل پڑا۔ ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی "ماں جی"...ماں جی... پانی پی لو... عورت نے اپنے کمزور ہاتھوں سے بوتل کو ہونٹوں سے ہٹایا اور سرد سی آواز میں بولی "مجھے روزہ ہے۔"(۳۲)

"عطیہ" عابد میر کا افسانہ "عطیہ" زلزلے کی تباہ کاریوں، حکمرانوں کی بے حسی اور زخمیوں کی حالت زار پر مبنی ایک موثر افسانہ ہے افسانے کا راوی زلزلے کی ہولناکی کو بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے:

"ملک کے ایک حصے میں زلزلہ آیا، سارا ملک ہی ہل کر رہ گیا۔ زلزلہ کیا تھا پوری قیامت تھی جو ایک پل میں گزر گئی تھی۔ بستیاں اجڑ گئیں، شہر مٹ گئے، ہزاروں لاشیں نکلیں، سینکڑوں ملبے تلے دبے رہ گئے تو لاکھوں بے گھر ہو گئے، ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔"(۳۳)

قیامت کی اس گھڑی میں جہاں قوم نے یکجہتی کا مظاہرہ کیا وہاں چند مقامات ایسے بھی تھے جہاں حکومتی امداد بروقت نہ پہنچ سکی۔ اس کی ایک وجہ تو راستوں کا بند ہو جانا تھا اور دوسری کہیں کہیں تباہی کی اطلاعات ہی کافی دیر سے موصول ہوتیں تھیں۔ ان علاقوں کے لوگوں میں ایسی صورت حال میں غم وغصے کے رجحانات بھی دیکھنے کو ملے کچھ لوگ اس کو خدا کی مصلحت سمجھ کر چپ ہو گئے لیکن کچھ کے ہاں حکومت کے خلاف شدید رد عمل بھی دیکھنے کو ملا کیونکہ بہت دن گزرنے کے باوجود لاشیں اور زخمی ملبے سے نہیں نکالے گئے اور جو بچ گئے تھے وہ کھلے آسمان تلے سخت سردی اور بارش میں موت کی دعائیں مانگنے پر مجبور تھے:

"ارے بے ضمیر حکمران جہاں مسلط ہوں گے وہاں یہی ہو گا نا... لوگ بھوک پیاس سے مر رہے ہیں اور یہ لوگ ایوانوں میں بیٹھ کر شکم سیر ہو کر ٹی وی پر آکر دنیا سے امداد طلب کراتے ہیں۔"(۳۴)

کہانی کا راوی اس ساری صورت حال سے اس قدر مایوس ہو جاتا ہے تو اسے سمجھ نہیں آتا کہ وہ اس مصیبت سے نکلنے کے لیے کیا کرے۔ آخر میں وہ ایک بنک میں جا کر اپنا ضمیر عطیہ کرنا چاہتا ہے تا کہ نادار اور لاچار لوگوں کی مدد کی جا سکے۔ لیکن بینک کا منیجر اس کو دھکے دے کر نکلوا دیتا ہے۔

"میں اپنے ہوش و حواس کے ساتھ اپنا ضمیر عطیہ کر رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ تو یہ بکا ہوا ہے اور نہ ہی مردہ ہے... آپ پلیز اسے ریلیف فنڈ میں جمع کرا کے لوگوں کی جان بچا لیجئے... منیجر کے چہرے کا رنگ سرخ ہو چکا تھا... لے جاؤ اس جاہل کو اور دھکے دے کر باہر نکال دو۔ پاگل خانے بھجوا دو اسے۔"(۳۵)

افسانہ عطیہ ایک درد مند دل رکھنے والے ایسے انسان کی کہانی ہے جو معاشرے کے بے حسی اور خود غرضی کے آگے بے بس ہے۔ افسانہ زلزلے کی تباہ کاریوں کے ساتھ انسانی اور حکومتی بے حسی سے نقاب کشائی کا کام سرانجام دیتا ہے۔

فرحت پروین کا افسانہ "تنکا تنکا آشیاں" ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنے گھر کے لیے پردیس میں سخت محنت کرتا ہے اور تنہائی اور جدائی کا دکھ سہہ رہا ہوتا ہے اچانک ایک روز وہ ٹی وی پر خبر سنتا ہے کہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور اسلام آباد میں بہت شدید زلزلہ ہے جس نے بڑے پیمانے پر تباہی مچائی ہے۔ وہ اس خبر پر حواس باختہ ہو جاتا ہے اور جلد سے جلد اپنے گھر اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا ہے۔ ائرپورٹ پر فلائٹ کا انتظار کرتے اُسے سخت بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ افسانہ نگار نے گل فروش کی بے چینی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"شاید ائیرپورٹ کی گھڑی بند ہو گئی ہے اور ہو سکتا ہے اس کی اپنی گھڑی بھی خراب ہو گئی ہو، وہ جا کر کسی مسافر سے ٹائم پوچھتا ہے اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا..."(۳۶)

اُسے ائیرپورٹ اور سارا راستہ وہ مناظر یاد آتے رہے جب اُسی کے پیاروں نے اُسے روتے بلکتے پردیس کے لیے روانہ کیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے خاندان کی سلامتی کی دعا کرتا جب

اپنے گاؤں پہنچتا ہے تو ہر طرف قیامت کے بعد کی تباہی بکھری پڑی تھی۔ وہ دیوانہ وار اس ملبہ بنے ڈھیروں میں اپنے گھر اور گھر کے مکینوں کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔

> "یہ اُس کا گھر تھا... ایک دم اُس پر وحشت سوار ہو گئی اور وہ دیوانوں کی طرح چیخ چیخ کر اپنے بچوں کے نام پکارنے لگا۔ کیا خبر... کیا خبر کوئی ان پتھروں کے نیچے سانس لے رہا ہو... اماں... اماں... کاش... وہ چند روز پہلے آجاتا... کاش اس کا انجام بھی ان کے ساتھ ہو جاتا۔"(۳۷)

افسانہ جہاں زلزلے کی تباہ کاریوں کا احوال سناتا ہے وہیں ان لوگوں کی بے بسی اور کرب کی بھی عکاسی کرتا ہے جو اپنے پیاروں کی لاشوں کو نہ دیکھ سکے۔

حوالہ جات

۱۔ شعیب خالق، زمین بنام سرکار، مشمولہ: آٹھ اکتوبر، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۳۶۲

۲۔ ایضاً، ص ۳۶۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۶۶

۴۔ محمد حمید شاہد، ملبہ سانس لیتا ہے، مشمولہ آٹھ اکتوبر، ص ۳۸۳

۵۔ ایضاً، ص ۳۸۶

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً، ص ۳۸۷

۸۔ شیر شاہ سید، ڈاکٹر، ترکی کا کمبل، مشمولہ، آٹھ اکتوبر، ص ۳۸۳

۹۔ ایضاً

۱۰۔ منشا یاد، آگے خاموشی ہے، مشمولہ آٹھ اکتوبر، ص ۳۸۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۸۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۹۵

۱۳۔ انو زاہدی، فالٹ لائن، مشمولہ آٹھ اکتوبر، ۴۰۷-۴۰۶

۱۴۔ انور انگینوی، الاماں، الاماں، الاماں، مشمولہ آٹھ اکتوبر، ص ۴۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۱۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۱۹

۱۷۔ حمزہ حسن شیخ، خاک میں چھپا چاند، مشمولہ آٹھ اکتوبر، ص ۴۲۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۲۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۲۴

۲۰۔ خالد قیوم تنولی، قیامت کے بعد، مشمولہ آٹھ اکتوبر، ص ۲۶-۴۲۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۲۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۲۷

۲۳۔ سجاول خاں رانجھا، آخری گیت، مشمولہ آٹھ اکتوبر، ص ۴۳۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۳۳

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ فیاض عزیز، کفن، مشمولہ: ادبیات، اسلام آباد، شمارہ ۷۱، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۵

۲۷۔ شاکر حسین، شاکر، ایک بچے کا خط اللہ میاں کے نام، مشمولہ آٹھ اکتوبر، ص ۴۳۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۳۹

۲۹۔ فرحین چوہدری، سفید بھالو، مشمولہ: آٹھ اکتوبر، ص ۴۴۳-۴۴۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۴۶

۳۱۔ قیوم ثروت، میر اروزہ ہے۔ مشمولہ آٹھ اکتوبر، ص ۴۴۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۴۵۰

۳۳۔ عابد میر، عطیہ، مشمولہ: انگارے، ملتان: شمارہ مارچ، ۲۰۰۶ء، ص ۲۶

۳۴۔ ایضاً، ص ۵۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۳۶۔ فرحت پروین، تنکا تنکا آشیاں، مشمولہ بیاض، ص ۴۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۵۳-۵۲